

# ایمان کیا ہے

مولانا بدر عالم میرٹھی

## کامل ایمان

شریعت میں ایمان و اسلام اتباع و اطاعت کی اس آخری منزل کا نام ہے جس کے بعد اوامرِ الہیہ اور منہیاتِ شریعیہ کے قبول کرنے سے قلب میں کوئی انحراف باقی نہ رہے۔ مخبرِ صادق پر وہ اعتماد حاصل ہو جائے کہ پھر دل کی تمام خوشحالی اور روح کا کامل سرور اس کی تصدیق میں منحصر نظر آنے لگے۔ گویا جذبہٴ وفاداری طلبِ دلائل کی مہلت نہ لینے دے۔ راہِ حق میں ہر نئی قربانی ایک نئی لذت ہو، اور ایک اونٹنی نافرمانی وہ تلخ گھونٹ ہو جائے جو گلے سے اتارے نہ اترے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (بقرہ ۲: ۳۴)

(یہ کتاب) راہ دکھانے والی ہے (اللہ) سے ڈرنے والوں کو، جو یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا۔

## ایمان بالغیب کی صفت

اس آیت میں ان ہی سرفروشوں کی اس سرمستی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ وہ جماعت ہے جو محض جذبہٴ اتباع میں دیکھی اور ان دیکھی باتوں کی یکساں تصدیق کر چکی ہے۔ آنکھ اگر دیکھتی اور تصدیق کرتی ہے، کان اگر سنتے اور مان لیتے ہیں، تو یہ ان کا فطری اقتضاء ہونا چاہیے۔ لیکن آنکھیں اگر نہیں دیکھتیں، کان اگر نہیں سنتے، پھر ان آنکھوں اور کانوں کے اعتماد پر جن کی صداقت پر سارا جہان قربان، اعتماد کر لیتے ہیں، تو پھر بلاشبہ یہ ان کے ایثار و تابع داری کی آخری دلیل ہو گی۔ یہی وثوق اور اعتماد ایمان کی روح ہے۔

## دلائل کی حقیقت

دلائل کی روشنی بھی کوئی روشنی ہے جو ایک قدم پر آکر چمکتی ہے تو دوسرے ہی قدم پر گل ہو جاتی ہے۔ اگر نبی صاحبِ وحی ہے، اور جو کتا ہے وہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے کتا ہے، تو

ایمان کیا ہے؟

اس کے اعتماد پر اس کے تمام دین کو تسلیم کر لینا ایک اقتضائے طبعی ہونا چاہیے۔ کسی حقیقت کے مسلم ہو جانے کے بعد بھی دلائل کی تلاش، روشن خیالی نہیں بلکہ ایک مختصر راہ کو اور طویل کر دینا ہے۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لانے کے بعد دعوتِ مناظرہ کے بجائے شروع سے عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر مدار صرف دلائل پر ہو، تو دلائل کبھی کبھی ہر دو طرف پیدا ہو جاتے ہیں ماسوا اس کے، مطالب کی نزاکت کبھی دلائل کی رسائی سے بالاتر ہوتی ہے۔ پھر مذاق کا تفاوت، سمجھ اور فہم کا اختلاف، اس پر وہمِ انسانی کی مزاحمت، یہ سب وہ موانع ہیں جو، نفسِ تصدیق کے لیے نہ سہی، مگر کم از کم عمل کے لیے تو یقیناً سدِ راہ بن جاتے ہیں۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے صرف اطاعت و اتباع ہی کی ایک راہ بتلائی ہے،

مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر: ۵۹)

جو کچھ رسول تمہارے پاس لے کر آئے اس کو اختیار کر لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ۔

دلائل کا وسیع دائرہ بھی کچھ دور جا کر آخر اسی اتباع پر ختم ہو جاتا ہے۔ ورنہ ایک مقصد کے حصول کے لیے مقدمات کی بے شمار کڑیاں درکار ہوں گی۔ اگر سب کا طے کرنا ضروری ٹھہرے، تو پھر تمام عمر میں ایک مقصد کا حصول بھی خواب و خیال سمجھ لینا چاہیے۔ بہ نظر انصاف، ایک تجربہ کار محقق کا قول خود ایسی محکم دلیل ہوتی ہے جو تین ہزار دلائل کا وزن اپنے اندر رکھتی ہے۔ آج بھی ہم اپنے دلائل و براہین کا سلسلہ آخر میں یورپ کے فلاسفوں کی تھیوریوں پر جا کر ختم کر دیتے ہیں، اور صرف ان کے اسماء کا حوالہ دے دینا دلائل کی وہ معراج تصور کرتے ہیں جس کے بعد تمام دلائل سے بے نیازی ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ تھیوریاں بے دلیل مسلم ہونے کے قابل ہیں، بلکہ اس کی تہ میں یہ علم یقین پہلے حاصل ہوتا ہے کہ یہ تھیوریاں ان فلاسفوں کے نزدیک چونکہ اپنے دلائل سے ثابت شدہ ہیں، لہذا ان دلائل کا تلاش کرنا، اور پھر ان کا دوہرانا، محض ایک مسافت کا طویل کرنا ہو جاتا ہے۔

علومِ نبوی کا مرتبہ

ٹھیک اسی پر علومِ انبیاء کو قیاس کر لینا چاہیے، اگرچہ چہ نسبت خاک رابا عالم پاک۔ ان کے علوم اپنی جگہ بھی ایسے دلائل سے ثابت شدہ ہوتے ہیں جہاں باطل کو کہیں سے راہ نہیں ملتی۔ لیکن وہ علم یقین کے اس مقام پر جا پہنچتے ہیں جس کے بعد ان کا لقب برہانِ مجسم ہو جاتا ہے،

لَا تَبْهَى النَّاسَ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا (النساء: ۳: ۱۷۴)

اے لوگو! پہنچ چکی ہے تمہارے پاس ایک سند تمہارے پروردگار کی طرف سے اور ہم نے تم پر واضح روشنی اتاری۔

### کمال تفویض و تسلیم

اس لیے انبیاء علیہم السلام کے علوم ان کے اعتمو پر تسلیم کر لینا کورانہ تقلید نہیں، بلکہ جسم ایک برہان اور حجتِ بینہ کی تقلید ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایمان کی تمام قیمت بندہ کی صرف یہ ادا ہے کہ وہ رسولِ وقت کے سامنے اپنی ساری لن ترانیاں ختم کر دیتا ہے۔ درحقیقت یہ اس کی زبردست قربانی ہے، جسے وہ اپنے ضعیف و ناتواں ہاتھوں سے اپنے رب کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے۔ انسان کی بے صبر فطرت اپنی جیسی مخلوق کو ایسے مقام پر کبھی دیکھنا پسند نہیں کرتی، جہاں بے دلیل سرنگوں ہو جانا تمام انسانوں کے لیے وقت کا سب سے بڑا فریضہ ہو جائے (یعنی رسول)۔ وہ خدائے تعالیٰ کی مخلوق ہے، اور اسی کی اطاعت اپنا فرض تصور کر سکتا ہے۔ اسی لیے مشرکینِ عرب میں بھی تمام جہالتوں کے بلوجود ایک جماعت خدا پرست تھی، اور بزعمِ خود توحید کا انکار نہ کرتی تھی۔

إِذْ أَقِيلَ لَهُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ (الصافات ۳۵:۳)

جب کہا جائے ان سے کہ سوائے اللہ کے کوئی (اور) معبود نہیں تو غرور کرنے

لگتے ہیں۔

یہاں لفظ **بجحد و ن** اسی لیے ارشاد نہیں فرمایا گیا کہ اس دعوت سے انہیں انکار نہ تھا۔

البتہ مسلمانوں کی آواز پر ان کا ہم آہنگ ہو جانا انکے نزدیک اپنی بڑائی کے خلاف تھا۔

### آدمؑ کو سجدہ کا حکم

عالم کا سب سے پہلا شقی، یعنی ابلیس، خالق السموات والارضین کی عبادت سے کبھی منکر نہیں ہوا۔ لیکن مشیتِ ایزدی نے اس کے دعوائے تابعداری کا جب امتحان لیا تو اپنی عبادت کا امر فرما کر نہیں لیا، بلکہ ایک مشتِ خاک کے سامنے سر جھکانے کا امر فرمایا۔ ظاہر ہے کہ سر جھکا دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر ہاں دشواری تھی تو یہ تھی کہ ایک ضعیف ہستی کے سامنے سر جھکانا، جو مخلوق ہونے میں اس کی برابر کی شریک ہو، اس کی آواز فطرت کے برخلاف اور بظاہر ایک بے دلیل بات تھی۔ اس سے رہانہ گیا اور

أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَ خَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ (الاعراف ۱۲:۷)

میں بہتر ہوں اس سے۔ (کیونکہ) مجھ کو بنایا ہے تو نے آگ سے اور اس کو بنایا مٹی سے۔

کا نعرہ لگا بیٹھا۔ دلائل کی پیروی کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا وہ ہوا۔ اس کا پوشیدہ کبر اور طبعی انحراف پھوٹا، اور آخر وہ تسلیم و رضا کی اس منزل میں چل کر ناکام رہ گیا، جہاں خیر و شر کا سوال ہی باقی نہیں رہتا اور چون و چرا کا میدان تنگ ہو جاتا ہے۔

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب  
کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

(اصل چیز دوست کی خوشنودی ہے، ہجر و فراق کی کچھ اہمیت نہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہو گی، اگر دوست سے کسی اور کی خواہش کی جائے)۔

طبعی انحراف و علو کا خاصہ

طبیعت کے انحراف کا یہ خاصہ ہے کہ وہ تلاشِ حق کی تمام توفیق سلب کر دیتا ہے، اور وہ نشہ پیدا کر دیتا ہے جس کے بعد اپنی ہوا، نفس کے سامنے دلائل و براہین کی کچھ پار نہیں بستی۔ اطراف و جوانب سے آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، اور اس بے شعوری کے عالم میں جو فیصلہ اپنے خیال میں آ جاتا ہے وہ آخری فیصلہ نظر آنے لگتا ہے۔ ابلیس نے صرف عنصرِ آتش کے شرف پر نظر کی۔ یہ اس کا قصورِ نظر تھا۔ عنصرِ خاک کو ضعیف ترین عنصر سہی مگر کیا ہو نہیں سکتا تھا کہ اس میں بھی کوئی جہت ایسی پیدا ہو جائے جو اسے قوی و برتر عنصر سے بھی افضل بنا دے۔ اگر ابلیس انسان کی صورت کی طرف بھی نظر کر لیتا تو اپنے ماہہ کا شرف اس کی آنکھوں سے او جھل ہو جاتا۔ عنصرِ آتش ہزار اشراف سہی، مگر یہاں صورت صرف ایک حرف کُن نے عطا کی تھی۔ عنصرِ خاک پر جو نقش و نگار نظر آئے وہ نقاشِ ازل کے خود اپنے دستِ قدرت کا بلا واسطہ کمال تھا۔

قَالَ يَا بَلِيسُ مَا مَنَّكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتَ بِيدِي اَمْ تَكْبُرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ (ص)  
(۷۵:۳۸)

فرمایا، اے ابلیس تجھے کس چیز نے روکا کہ سجدہ کرتا اس کو جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا تھا۔ یہ تو نے غرور کیا یا تو درجہ میں بڑا تھا۔

نصبِ خلافت سے پہلے ہی یہ سبق تمام نسلِ انسانی کو دے دیا گیا تھا کہ اسے بھی اپنی اطاعت و انقیاد کا امتحان دینا ہو گا۔ کامیابی صرف اس صورت میں متصور ہو گی جب کہ، خدائے رب العزت کی رضا جوئی میں، اس کے رسولوں کے لیے بھی بے دلیل وہی جذبہٴ اطاعت پیدا ہو جائے جو خود اس کے لیے موجزن ہو سکتا ہے۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہو گی کہ رسولوں کی باتوں

پر بے دلیل یقین کر لینا کیوں رکنِ ایمان قرار دیا گیا ہے۔

### کمالِ محبت، محبوب کی رضا میں فنا

حدیث شریف میں انصار کی محبت کو علاماتِ ایمان میں شمار کیا ہے۔ رسول اور اس کے کنبہ و قبیلہ یا ہم وطن کی محبت تو ہر مسلمان میں طبعی طور پر بھی ہو سکتی ہے، اور ہونی بھی چاہیے۔ مگر انصار کی محبت، جو نہ اس کا ہم قبیلہ تھے نہ ہم وطن، اگر ہو سکتی ہے تو صرف اس لیے کہ انہوں نے رسول کی ایسے آڑے وقت اعانت کی تھی جب کہ اس کے قبیلہ تک نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور بلاشبہ یہ محبت کمالِ ایمان ہی کا ثمرہ ہو سکتی ہے۔ محبوب تو نظرِ عاشق میں سرتا سر محبوب ہوتا ہے۔ مگر اس میں کمال کیا ہے کہ اس کی ہر ہر ادا عشاق کی دلربائی کا مستقل ایک ایک افسوں ہوتا ہے، کمالِ محبت تو یہ ہے کہ اس کی رضا میں وہ فنا میسر ہو جائے کہ پھر یگانہ و یگانہ، مکروہ و محبوب کا امتیاز جاتا رہے۔ بلکہ تمام محبت و شفقت، ہمدردی و سلوک، تعاون و سازگاری کا وہی ایک محور و مرکز بن جائے۔ مل و اولاد کا تو ذکر کیا ہے، اپنے نفس سے اگر محبت رہ جائے تو وہ بھی اسی کی خاطر ہو۔ اِنَّ صَلَوَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحَايَا وَمَسَاعِيْ لِلدَّرَجَاتِ الْعَالِيْنَ۔

اس کی راہ میں تمام قربانیاں شیریں بن جائیں۔ اس کے خلاف میں ساری خوشحالیاں کانٹے نظر آئیں۔ اس کے نام پر گردنیں اتروا دینا حیوۃ ابدی معلوم ہو۔ اپنی قربان گاہ سے ایک قدم پیچھے ہٹانا موتِ ابدی نظر آئے۔ اور یہ سب کچھ اس تصور میں ہو کہ یہ ساری جاں نثاریاں گو اس قاتل نہ سہی کہ محبوب کے لیے قاتلِ نظر ہوں، مگر ایک عاشق کی یہ حسرت ہونا چاہیے کہ راہِ عشق میں جو قربانی وہ کر سکتا ہے کر گزرے۔ حضرت بلالؓ کے سرفروشانہ جذبہ پر سیرت نگاروں کو حیرت ہے۔ مگر خود ان کی زبانی دریافت کیا جاتا تو ساقی کوثر کے ہاتھ سے ان جام پینے والوں سے شاید انہیں شکایت ہوتی جنہیں اس کے ہاتھ سے جام پنی کر تکلیف و راحت کا احساس باقی تھا۔

ازاں افیوں کہ ساقی کردہ بدست

رفیقان را نہ سر ماند نہ دستار

(ساقی نے جس چیز سے بدست کر رکھا ہے، اس سے دوستوں کو کسی چیز کا ہوش نہیں ہے)۔

ایمان میں اسی منزل کا نام مقامِ یقین ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ عقلِ انسانی جب نشہ

یقین سے مخمور ہو جاتی ہے تو قلب و نفس بھی اس سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ پھر عالمِ غیب پر انکو محسوسات کی طرح یقین ہو جاتا ہے، فقر و غنا، حیوۃ و موت کے خرخشہ سے انسان بے

نیاز ہو جاتا ہے، اسباب کے قید و بند سے رستگاری میسر آ جاتی ہے۔

### مذہب کی روح اور بنیاد

یہ ہے وہ ایمان جس پر مذہب کی تمام بنیاد قائم ہے۔ کوئی عقیدہ اپنے دامن میں خواہ کتنی ہی نزاہت اور رفعتیں کیوں نہ رکھتا ہو، مگر اس نورِ ایمانی کے بغیر نظرِ شریعت میں وہ صرف ایک ظلمت کدہ اور سرتاسر تاریکی ہے۔ کوئی عمل، مجاہدات و ریاضت کے خواہ کتنے ہی مراحل کیوں نہ طے کر چکا ہو، مگر بدون اس روحِ ایمانی کے ایک تنِ مردہ اور میزانِ آخرت میں قطعاً بے وزن ہے۔

لَا نُفِئُكُمْ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزَنًا (کلمت ۱۰۵:۱۸)

پس ہم ان کے لیے قیامت کے دن کوئی تول قائم نہ کریں گے۔

عقائد و اعمال کا تو ذکر کیا ہے، کوئی معمولی سی معمولی سیت بھی، خواہ کتنی ہی صاف و ستھری کیوں نہ ہو، اس سرمایہٴ ایمان کے بغیر بارگاہِ بے نیاز میں کوئی اعتبار نہیں رکھتی۔ یہ ایمان، عقائد و اعمال اور نیوٹوں کی وہ واحد روح ہے جس کے بعد کفر کی توہر تو تاریکیاں چشمِ زدن میں کانور ہو سکتی ہیں۔ آتش کدہٴ جہنم اس کے روبرو سرد ہو سکتا ہے، اور گلزارِ عدن اس کا ایک طے شدہ معلوضہ بن جاتا ہے۔ ایک معمولی سجدہ طاعتِ صد سالہ کے لیے مایہٴ رشک اور مٹھی بھر جو کا صدقہ بے شمار تضاعیف (زیادتیاں) کا مستحق نظر آنے لگتا ہے۔ غرض سعادتِ ابدیہ اسی مبداء کی خبر ہے، اور شقاوتِ ازلیہ اس سے محرومی کا نشان ہے۔ یہ سب کچھ اس سچی کتاب میں موعود ہے جو غلط گوئی سے بالکل منزہ اور مبالغہ آمیزی سے یکسر مبرا ہے۔